Date of Publication: 02-04-2014

PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 03-04 April. 2014
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C) 160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

08-14 April 2014
Issue: 14, Vol.: 73

۸ تا ۱۴ اپریل ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۱۴، جلد نمبر: ۷۳

ہندوستانی تاریخ کے جن تقاضوں نے اردو زبان کو جنم دیا تھا، ان میں سے ایک اہم تقاضا دو الگ قوموں میں ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنا تھا، جو اپنی جداگانہ حیثیت کے باوجود قومیت کے اعتبار سے ایک نئی صورت اختیار کر رہی تھیں۔ یلغار کے بعد وطن لوٹنے والے حملہ آور مسلمانوں کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا اور فاتح مسلمان ہندوستان کو مستقل طور پر اپنا وطن بنا چکے تھے۔ یہ مسلمان عرب سے آئے ہوں یا ایران و توران سے، ترک رہے ہوں یا منگول، اب ان کی قومیت ہندوستانی تھی اور ان کا ملک ہندوستان تھا۔ اس صورت میں یہاں کے ہندوؤں کے ساتھ بیان و اظہار کے مشکل مراحل کو طے کرنے کی ذمہ داری اردو پر عائد ہوئی، لہٰذا اپنی ابتدا ہی سے اردو کو جو وصف اعلا نصیب ہوا، وہ قومی یک جہتی کی راہ کا

سرزمین کے ساتھ جوڑنے کا اہم فریضہ بھی سرانجام دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عرب و ایران کے مولوی، قاضی، ملا، میاں، حافظ اور قاری کو 'جی' کا لقب عطا ہو گیا اور وہ پورے ہندوستان میں قاضی جی، ملا جی، میاں جی، حافظ جی اور قاری جی کے نام سے جانے جانے لگے۔

یہ ملی جلی تہذیب اور یہ مشترکہ تمدن اردو زبان کے جنم کے ساتھ ہی خون کی طرح اس کی رگوں میں دوڑنے لگا کیوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ضرورت کے پیش نظر اسے نہ صرف ذریعہ تکلم ہونا تھا بلکہ اس کے ذریعے ہندوؤں کو تہذیب کے اس ایوان تک پہنچنا تھا جہاں اسلامیت کے چراغ جھلملا رہے تھے اور اسی کے توسل سے مسلمانوں کو گنگا کے تقدس اور گومتی و متھرا کی عظمت سے روشناس ہونا تھا۔ بچپن

اردو ادب اور قومی یک جہتی

ڈاکٹر نریش
169، سیکٹر 17، پنچکولہ-134109

اولین سنگ میل تھا، اس لیے ہندوی اور ریختہ سے لے کر اردوئے معلی تک کے اپنے سفر میں اردو زبان، بیان کا ذریعہ ہی نہ رہی بلکہ اس نے دو قوموں کو، دو مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگوں کو مشترک تہذیب و تمدن کے رشتے میں باندھنا شروع کیا۔ لہٰذا اپنے ابتدائی دور ہی میں اسے جو ہندوستانی علاقائی تخلیقات سے متاثر ہونے کا موقع مل گیا۔ اردو کی پرورش میں جہاں آریائی ثقافت کے سوم رس کا نشہ کارفرما رہا تو کہیں سنسکرت کے عظیم شعرا کی تخلیقات کا جادو۔ اس کی نشوونما میں وہ متعدد عناصر بھی شامل رہے جو یونان اور توران کے لوگ اپنے تمدنی سرمایے کی صورت میں اپنے ساتھ لے کر یہاں آئے تھے۔ مشترکہ تہذیب و تمدن کا حسن و جمال، انسانی رواداری اور اخوت کا درس بے مثال، حملہ آور کو اپنی سماجی زندگی میں رچ بس جانے کا صبر و استقلال جب اس زبان کے شعور سے وابستہ ہوا تو اس نے دیار غیر سے آنے والے لوگوں کا رشتہ ہندوستان کی

ہی سے صوفیوں اور درویشوں کے دست شفقت سے بہرہ یاب ہونے والی اردو کے رگ و پے میں انسان دوستی، دوسروں کے عقیدے کے تئیں احترام، باہمی رواداری، خلوص اور محبت خون کی طرح رواں دواں ہو گئے۔ قومی یکجہتی کی راہ میں اردو کا دوسرا قدم یہ تھا کہ اس کو صوفیوں اور فقیروں کی عام فہم بولی کے روپ میں انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لا کر ان کو مذہب و ملت کی دیواروں میں قید ہونے سے بچانا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب مفتوح ہندوؤں کے دلوں میں فاتح مسلمانوں کے خلاف نفرت کا جذبہ بھڑک سکتا تھا لیکن صوفیوں اور درویشوں نے تقریر و تحریر کے ذریعے انسان اور انسان کے درمیان دیوار اٹھانے والے اس جذبے کو پریم بانی کی لوریاں سنا سنا کر سلائے رکھا۔

[illegible]
یا مسلماں اللہ اللہ یا برہمن رام رام

یہ شیوہ اختیار کر کے صوفیائے کرام نے اس دور کے اجتماعی شعور کو جس خوب صورتی کے ساتھ اور جس سادگی سے باہمی تعلق سے متوازن رکھا ہے، اس میں اردو کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اس دور کے اردو شعرا میں جہاں ایک طرف امیر خسرو ہندوستان کی عظمت کے گیت گاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں وہاں دوسری طرف خواجہ گیسو دراز، میراں جی، برہان الدین جانم اور شاہ علی جیو جیسے باکمال شعرا انسان دوستی اور اخلاص و محبت کے درس سے ہر دور کے تعصب و تنگ نظری کو شکست عطا کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان صوفی شعرا نے عبد و معبود کے رشتے کو محبت کا نام دے کر خدا سے محبت کے لیے اس کے بندوں سے محبت کا جو درس دیا وہ ہمارے اجتماعی لاشعور میں گہرے اتر گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری اپنے ابتدائی دور ہی میں عربی و ایرانی و شامی و ترکی اثرات کو قبول کرنے کی بجائے ہندوستان کی مٹی کی بو باس میں رچ بس کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ بھارت کی دھرتی کی یہ مہکی مہکی سگندھ کہیں قلی قطب شاہ کے یہاں عورت کی طرف سے اظہار عشق کی خالص ہندوستانی روایت کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے تو کہیں ولی کے یہاں کرشن کی بانسری کی تان بن کر لہرا اٹھتی ہے۔ کہیں سراج کے یہاں گوپیوں کے سنگ راس رچاتی ہے تو کہیں شاہ تراب کے یہاں بسم اللہ الرحمن الرحیم کے اس ترجمے میں ڈھل جاتی ہے:

صفت اول اس کی کہ جو رام ہے
اسی رام سوں ہم کو آرام ہے

لیکن یہ وہ دور تھا جس میں قومیت کوئی اہم سنجیدہ مسئلہ نہ تھی۔ اس حقیقت کے باوجود کہ چندر گپت اور اشوک کے زمانے میں ہندوستان نے سیاسی اتحاد حاصل کر کے ایک بہت بڑی اکائی کی صورت اختیار کی تھی مگر اس کے سیاسی اتحاد کا شیرازہ اکثر بکھرتا رہا ہے اور یہ ملک مختلف سیاسی اکائیوں میں منقسم رہا ہے۔ تاہم اس کی مختلف اکائیوں اپنے اختلافات کے باوجود ہمیشہ ہی تہذیبی اعتبار سے یکسانیت اور اتحاد کے دھاگے میں بندھی رہی ہیں۔ مغلیہ دور سلطنت میں اس تہذیبی اتحاد نے سیاسی اتحاد کی صورت اختیار کر لی اور قریب قریب پورا ہندوستان جو کبھی ماضی بعید میں ایک جغرافیائی اکائی بھی رہا تھا، پھر سے ایک اکائی کی صورت میں نظر آنے لگا، مگر اٹھارہویں صدی میں آ کر یہ اکائی ٹوٹنے لگی اور مرکزی حکومت کو توڑ کر چھوٹی چھوٹی طاقتوں نے ملک کے مختلف علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ تاریخ کے اس موڑ پر انگریز نمودار ہوتے ہیں۔ تاجر سے حاکم بنتے ہی انگریزوں کو ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہندوستانی سیاست پر جیسے جیسے انگریز سامراجیت کی پکڑ مضبوط ہوتی گئی، یہاں کے عوام میں علاقائی شعور بڑھنے لگا۔ ہندو اور مسلمان کے درمیان خلیج پیدا کرنے کی شعوری کوششیں شروع ہوئیں اور رفتہ رفتہ وہ حالات پیدا ہو گئے جب مختلف قوم کے تصور کو ہوا دے کر بالآخر ملک کو تقسیم کر دیا گیا۔ یہیں سے اردو کی آزمائش کا دور شروع ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام کے زمانے سے لے کر قلی قطب

شاہ کے زمانے تک اور قلی قطب شاہ سے لے کر نظیر اکبرآبادی تک اردو ادب نے جس ملی جلی تہذیب اور جس مشترکہ تمدن کو اپنا کر ہندوؤں، مسلمانوں، بودھیوں، جینیوں اور پارسیوں کو مادر وطن کی عقیدت اور محبت کے رشتوں میں باندھ رکھا تھا، وہ رشتے جب علاقائی، نسلی اور لسانی شعور کی بیداری سے مجروح ہونے لگے تو اردو کے سامنے ایک بہت بڑا چیلنج آ کھڑا ہوا، بقول غالب:

تھی نگہ میری زنار کے پھندے میں گرائی
رواداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

آزمائش کے اس دور میں اردو نے ثابت قدمی کا ثبوت دیا۔

پہلی جنگ آزادی کے دوران اردو شعرا نے حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر وہ شعلہ بیانیاں کیں، عوام کے احساس خودداری کو اس قدر بیدار کیا کہ انگریزی حکومت نے متعدد اردو شعرا پر بغاوت کا الزام لگا کر ان کو گرفتار کیا اور پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا۔ مادر وطن پر شہید ہونے والے ان اردو شعرا کی طویل فہرست میں سے مولوی عبدالعزیز عزیز، میر احمد حسین میکش، مرزا خدا بخت قیصر، نواب مظفر حسین، سعید احمد، اسماعیل فوق کے اسمائے گرامی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو کے کیسے کیسے باکمال شعرا نے ملک کی سالمیت اور مادر وطن کی آزادی کے لیے جان کی بازی لگائی تھی۔ بہادر شاہ ظفر اور نواب واجد علی شاہ دونوں اردو کے شاعر تھے اور دونوں نے حب الوطنی کی قیمت یہ ادا کی کہ دونوں کو دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں۔

پہلی جنگ آزادی کے بعد تعمیر معاشرہ کا دور آیا۔ مذہب، تمدن اور ثقافت کے نام پر کتنے ہی تاریخ ساز ادارے افق وطن پر اپنی تاب دکھانے لگے۔ ان اداروں کی طرز فکر پر بھی اعتراض کیا جا سکتا ہے اور طرز عمل پر بھی لیکن مجموعی طور پر ان کی تحریکوں میں ہندوستانیت کا جو دھارا بے روک ٹوک بہہ رہا ہے، اسے کسی بھی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں بھی اردو فراخ دلی اور کشادہ دامنی کے ساتھ ہر مکتب خیال کے اظہار و بیان کا ذریعہ بنتی ہے۔ پہلی جنگ آزادی کو قومی جہاد کی صورت عطا کرنے والے اخبارات 'اردو اخبار' (جس کے مدیر مولانا محمد حسین آزاد کے والد محمد باقر تھے) اور 'پیام آزادی' (مدیر عظیم اللہ) سے لے کر 'تبلیغ' اخبار تک اردو صحافت اگرچہ کسی نہ کسی خاص انداز فکر سے وابستہ نظر آتی ہے مگر خوب صورتی یہ ہے کہ ہر انداز فکر کے لیے ایوان اردو کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ کہیں 'ست دھرم پرچارک' اور 'دھرم جیون' جیسے اخبارات ہندو دھرم کے پرچار میں محو ہیں، کہیں 'تحفۂ محمدیہ' اور 'انجمن اسلامی' جیسے اخبارات تبلیغ اسلام میں مصروف ہیں، کہیں 'شری گورمت پرکاشک' اور 'خالصہ پنتھ' جیسے اخبارات سکھ مت کی تشریح میں مگن ہیں، کہیں 'خیر خواہ ہند' تو مسیح عیسائیت کے لیے کوشاں ہے، کہیں 'جین پرکاش' جینیوں کی بیداری کے لیے سرگرم تلقین و تدریس ہے، کہیں 'تشحیذ الاذہان' احمدیہ فرقے کی آبیاری میں مستغرق ہے اور کہیں 'مجمع البحرین' شیعہ عقائد کی حمایت میں منہمک ہے۔ مگر ان تمام اخبارات کی زبان اردو ہے اور باوجود اس کے کہ ہر اخبار ایک الگ انداز فکر اور جداگانہ طرز عمل کی راہ پر گامزن ہے، ان تمام اخبارات میں مجموعی طور پر ایک ہی دھارا بہتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور وہ ہے قومی بیداری اور قومی یکجہتی کا دھارا۔ اس کے ثبوت میں اتنا ہی بتا دینا کافی ہوگا کہ ان میں سے اکثر اخبارات نے دوسرے مذاہب کی تعظیم کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کا عالم یہ بھی رہا کہ 'دھرم پرچارک' اخبار کے مدیر صادق حسین نام کے ایک مسلمان تھے، ہفت روزہ 'سبھا' کی ادارت برکت علی کے سپرد کی گئی تھی اور سندری خاں نامی ایک مسلمان نے 'گئو رکشا' نام کا اخبار نکالا تھا۔

کثیر النسل، کثیر المذاہب اور کثیر اللسان ہندستان میں قومی یکجہتی کی ضرورت کا شدید احساس دوسری جنگ آزادی کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ وہ قوموں کی تعمیر پر کام کر رہی انگریز حکومت نے حکومت بذریعۂ تفریق کا چلن اختیار کر کے انسانی فکر اور انسانی شعور کو مشتعل کرنے کی بھرپور کوششیں کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اچھے بھلے لوگ درندے بننے لگے۔ بھائی کو بھائی کے خون کی تشنگی محسوس ہونے لگی۔ نفرت کا بھوت مجسم ہو کر گلیوں گلیوں گھومنے لگا۔ قتل و خون کے بازار سجنے لگے۔ اس صورت حال سے عقل انسانی دم بخود بھی ہوئی اور ذہن انسانی مجروح بھی ہوا۔ حیوانیت کا یہ شیطان گلیوں گلیوں، کوچوں کوچوں صدائے کدورت بن کر دوڑ پڑا۔ شہروں شہروں دوزخ کی آگ کی طرح پھیلتا گیا۔ مگر اردو کا کوئی بھی شاعر یا ادیب ایسا نہیں ہے جس پر یہ الزام لگایا جا سکے کہ اس نے شیطانیت کے اس رقص کی حمایت کی ہو۔ اس دور کا اردو ادب، شاعری ہو یا نثر، ناول ہو یا افسانہ، ڈرامہ ہو یا مضمون نگاری، ہر صنف سخن میں یکساں طور پر قومی شعور کو ملحوظ نظر رکھا گیا ہے۔ اس دور کے اردو ادب نے انسان کو انسان کے قریب لانے کی کوشش کی ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ محمد عربی کی نسل میں پیدا ہوئے شعرا نے اس دیس کی مٹی کی بو باس اپنی سانسوں میں بھری۔ یہاں کے کھیت کھلیان، یہاں کے کوہ و دریا، یہاں کے موسم اور تہوار، یہاں کی تہذیب، یہاں کا تمدن ان کی طبیعت کا خاصہ بنا، ان کے فکر کا، ان کے تخیل کا، ان کے شعور کا، ان کے وجدان کا جزو فطری بن کر ظاہر ہوا۔ ابتدا میر تقی میر سے لے کر نظیر اکبرآبادی تک اردو شاعری کے آنگن میں جو ہولی کا پھاگ اڑ رہا تھا، جو دیوالی کے دیپ جگمگا رہے تھے، جو بسنت کی بہاریں کھل رہی تھیں، جو راکھیوں کے زریں تار جھلملا رہے تھے، انھیں مزید تقویت ملنے لگی۔ جواباً مادر اردو کی گود میں پلی رام اور کرشن، بدھ اور مہاویر کی اولاد نے سرزمین عرب سے آئی صدائے توحید کو اپنے نغموں میں بھر لیا۔ یہ شعرا ہلال عید دیکھ کر شاد کام ہونے لگے، شب برات کی پھلجھڑیوں میں ان کی امنگوں کی چمک شامل ہوگئی، شہیدان کربلا کے ماتم میں ان کی آنکھیں بے اختیار برس پڑیں۔ ان شعرا نے رسول پاک حضرت محمدؐ کو بھی اسی عقیدت کی نظر سے دیکھا، جس نظر سے وہ اوتاروں کو دیکھتے تھے۔ اسی ذہنی ہم آہنگی اور احترام عقائد غیر کے جذبے سے مالا مال ہوئے اردو ادب کے آنگن میں جہاں ایک طرف نعتوں اور منقبتوں کے سریلے بول گونج اٹھے، وہاں دوسری طرف کرشن کی بانسری کی مدھر تان بھی لہرا اٹھی۔ اسی آنگن میں کھلے پھولوں میں شہیدان کربلا کے عزم و استقلال کا سرخ رنگ بھی ہے اور گوتم بدھ کے نروان کا سفید رنگ بھی۔ ان پھولوں میں ابن مریم کی قربانیوں کی خوشبو بھی اور مہاویر کے تیاگ اور اہنسا کی خوشبو بھی۔ اردو ادب جہاں ایک طرف حسینؑ کے تیغ و تبر کی جھنکار سناتا ہے، وہاں اس کے قارئین ارجن کے گانڈیو اور رام کے دھنش کی ٹنکاروں سے بھی مانوس و آشنا ہوتے ہیں۔ اردو ادب نے اپنے قاری کے ایک کان میں اذان کی آواز بھری تو دوسرے کان میں ناقوس کی صدا بھی بھر دی۔ رواداری اور آپسی میل جول کا یہ رشتہ اس قدر فطری ثابت ہوا کہ قارئین اردو ادب بشیشر پرشاد منور کے ذریعے قرآن حکیم تک پہنچتے ہیں، جعفر علی خاں اثر کے ذریعے گیتا تک ان کی رسائی ہوتی ہے اور خواجہ دل محمد کے ذریعے وہ جپ جی صاحب کے ایوان عرفان میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ برج کی کے چاند کا جلوہ دیکھنے کے لیے نظیر اکبرآبادی کی رہنمائی سے مستفیض ہوتے ہیں، رام کی عظمت کا جلوہ دیکھنے کے لیے ڈاکٹر اقبال کی آواز کا دامن تھامتے ہیں تو حضرت امیر خسرو اور حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ تک ان کو منشی دوارکا پرساد افق، تلوک چند محروم اور گوپی ناتھ امن لے جاتے ہیں۔ ہمہ گیری اور رواداری کا یہی جذبہ اردو نثر میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ویدوں، منوسمرتی، گیتا اور رامائن کے تراجم کے علاوہ اردو میں ایسی متعدد کتابیں موجود ہیں، جن میں جین، بدھ، پارسی اور عیسائی عقائد کی تفسیریں ملتی ہیں۔ افسانوں اور ناولوں میں مختلف کرداروں کے ذریعے اخلاص و محبت کی جو راہ دکھائی گئی ہے، اس میں پریم چند کے 'میدان عمل' سے لے کر ۱۹۴۷ء کے فسادات کے پس منظر میں لکھے گئے کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عباس اور رام لعل کے افسانوں تک اور عصمت چغتائی کے ڈرامے 'دھانی بانکپن' تک قومی یکجہتی کا دھارا بے روک ٹوک بہہ رہا ہے۔ یہ وہی دھارا ہے جو کبھی رجب علی بیگ سرور کے 'فسانۂ عجائب' میں لکھنؤ کی ہمہ گیر زندگی کا مظہر بن کر جاری ہوا تھا، امانت کے 'اندر سبھا' میں سماجی شعور بن کر ابھرا تھا۔ پریم چند نے مقامی رنگ کو اپنا کر ادب اور دھرتی کے رشتے کو استحکام بخشا اور ادب کو قوم پرستی سے ہم کنار کیا۔ یہی دھارا سدرشن، قرۃ العین حیدر، علی عباس حسینی اور بلونت سنگھ کے افسانوں میں رواں دواں ہے۔

ہمارے ملک کی ایک عجیب مشکل یہ بھی رہی ہے کہ ہم ابھی تک اپنے اندر قومیت کے اس شعور کو پیدا نہیں کر سکے ہیں جو بعض دیگر ممالک میں آباد قوموں کے اندر موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ابتدا ہی سے کثرت میں وحدت کے متلاشی رہے ہیں۔ اس ملک کے ایک قدیم مذہب ہی کی مثال لے لیجیے، ہر وہ شخص جو کسی ہندو کے گھر میں پیدا ہوا ہے، ہندو ہے، چاہے وہ خدا کو مانتا ہو یا نہ مانتا ہو، سناتنی ہو یا آریہ سماجی، رادھا سوامی ہو یا نرنکاری، ویشنو ہو یا شیو، شاکت ہو یا نراکار برہم کا پجاری۔ ہندو سماج میں آپ کو سیکڑوں بلکہ ہزاروں ایسے کنبے مل جائیں گے جن میں ماں سناتنی ہے، باپ آریہ سماجی، بیٹے رادھا سوامی اور بیٹیاں شاکت۔ مگر اس سے گھر کی اکائی پر کوئی ضرب نہیں آتی، نہ کبھی عقائد کا یہ اختلاف ان کی اجتماعی زندگی کے لیے مضر ہوا ہے۔ یہی حالت ہمارے ملک کی ہے۔ ابتدا ہی سے یہاں مختلف مذاہب کے لوگ آ کر آباد ہوتے رہے ہیں۔ آریائی اور دراوڑی تہذیبیں گنگا جمنا کی طرح ساتھ ساتھ بہتی رہیں۔ شک، ہون، مسلمان، عیسائی، پارسی نسلیں، اپنے انفرادی وجود کے باوجود اس ملک کے تہذیبی اور تمدنی دھارے میں شامل ہوتی گئیں۔ اس لیے اردو تو کیا ہندستان کی کسی بھی زبان کے ادب سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ قومی شعور کی تعبیر پیش کر کے معاشی، اقتصادی، سماجی اور سیاسی پہلوؤں سے قومی یکجہتی کے کسی جامع تصور کو لے کر چل رہا ہو۔ ایسے حالات میں ادب میں ان عناصر کی تلاش پر ہی اکتفا کرنا ہوتا ہے جن سے ایک ملک میں رہنے والے مختلف عقائد اور مختلف نسلوں کے لوگ یگانگت کے ایک مضبوط دھاگے میں بندھ جائیں۔ یہاں دو چیزیں بہت اہم ہوتی ہیں، اول یہ کہ یگانگت کا احساس اور رواداری کی روایت کو بہر طور زندہ رکھنے کی سعی ادب میں ہوتی رہی ہو۔ دوسرے یہ کہ کسی آزمائش کے وقت پر ادیبوں کا مثبت رول سامنے آیا ہو۔ اردو کے خمیر میں یہ دونوں اوصاف موجود رہے ہیں۔ اردو ادب نے کبھی بھی رواداری کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ قومی سطح پر آزمائش کے جو مواقع درپیش ہوئے ان میں سے پہلی جنگ آزادی اور تحریک آزادی کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ آزمائش کے ان دو ادوار میں اردو شاید ملک کی دوسری زبانوں سے آگے نکل گئی تھی۔ قومی سطح پر اردو

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

موازنۂ کلامِ غالبؔ و صفیرؔ بلگرامی

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی (فاطمہ منزل، ڈگی روڈ، علی گڑھ)

سید فرزند احمد صفیر بلگرامی ابن سید احمد عبداللہ عرف سید احمد بلگرامی متخلص احمد یا عاشق ۲۷/ ذی قعدہ ۱۲۴۹ھ مطابق ۸/ اپریل ۱۸۳۴ء کو مارہرہ شریف، ضلع ایٹہ میں شاہ سید صاحب عالم صاحب (۸۸-۱۲۱۱ھ) متخلص صاحب کے یہاں پیدا ہوئے تھے۔ عمر کی دوسری برس آپ مارہرہ سے بلگرام محلہ میدان پورہ میں اپنے بزرگوں کے ساتھ تشریف لے آئے، پھر آبا و اجداد کے ساتھ آرہ (بہار) آ گئے۔ اس ذیل میں صفیر بلگرامی کا مشہور شعر ہے:

مولد و مسکن وطن ہے اے صفیر
تین جا مارہرہ آرہ بلگرام

آرہ، مارہرہ اور بلگرام کی علمی و دانشوری فضا نے صفیر کو بچپن سے ہی زبان و ادب سے دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ آپ نے پہلے تخلص قلق اختیار کیا، ایک مقطع ملاحظہ ہو:

رو دیا ان کے ہونے کے لیے ایک اے قلق
سوگند، قسم ہے بھی کھایا نہ کریں گے

قلق کے سوا آثم، وحشم، ضیاء، کمال اور اختر کے بعد آخر صفیر کو دائمی تخلص اختیار کیا۔ آپ کے اساتذہ میں سید محمد مہدی قیر بلگرامی، بحر لکھنوی کے سوا مرزا دبیر، مرزا غالب کے نام بھی شامل ہیں۔

صفیر بلگرامی پر ڈاکٹر ظفر اوگانوی کا مقالہ 'صفیر بلگرامی' سال ۱۹۷۶ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مقالے کے ممتحن پروفیسر سید احتشام حسین رضوی اور پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی تھے۔ اس مقالے میں بعض خامیاں راہ پا گئی ہیں مگر حق یہ ہے کہ صفیر بلگرامی پر جس محققانہ انداز میں کام کیا گیا ہے، وہ لائق تعریف ہے۔

صفیر بلگرامی شاعر ہی نہیں تھے، شاعر گر بھی تھے، جن کی تعداد خاصی تھی۔ 'مرقع فیض' میں ساٹھ سے زائد شاگردوں کے نام ہیں۔ اس رسالے کی طباعت ۱۲۹۵ھ میں ہوئی تھی، یعنی اب سے 140 سال قبل، اور وفات صفیر بلگرامی سے بارہ سال قبل یعنی اس عرصے میں شاگردوں کا مزید اضافہ ہوا ہوگا۔

ایک لطف کی بات اور کہ غالبؔ دہلوی نے اپنے شاگرد صفیر بلگرامی کو ایک خط میں لکھا:

سنین عمر کے ستر ہوئے شمار برس
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

اس شعر کے جواب میں شاگرد نے اپنے استاد کو دعائیہ جواب بھی شعر ہی سے دیا تھا:

سنا صفیر یہ کہتے ہیں حضرت غالبؔ
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس
مگر یہ پہلے سے اعداد تین کی ہے رکھا
خدا کرے مرا غالبؔ جیے ہزار برس

اس تفصیل سے قطع نظر غالبؔ (۱۸۶۹-۱۷۹۷ء) اور صفیر بلگرامی کی عمر (۱۸۹۰-۱۸۳۴ء) میں جو فرق نمایاں ہے اس سے آپ سب واقف ہیں۔ اس تحریر کے ذریعے ایک نادر و یگانہ بات عرض کرنی مطلوب ہے کہ کلام غالب اور صفیر بلگرامی کے کلام شعری کی مماثلت کس عنوان سے تھے، اہل علم نے بھی اس کا موازنہ نہ کیا ہوگا۔ راقم نے ڈاکٹر ظفر اوگانوی سے بھی ایسے موازنے کی فرمائش کی تھی مگر ان کو شاید موقع نہ ملا یا اس کی ضرورت نہ خیال کی، مگر آج میں اہل علم کے سامنے ان اشعار کو لا رہا ہوں، اسے جسارت خیال کریں یا استاد کے کلام کا تتبع۔ پہلے استاد سخن مرزا غالب کے اشعار پڑھیے (اگرچہ آپ ان کو کئی بار پڑھ اور سن چکے ہوں گے) پھر بھی تکرار میں بھی لطف ملے گا:

غزل مرزا غالب

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
داغ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی
کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

غالب کی پیدائش آگرہ کی تھی مگر وفات ۱۵/ فروری ۱۸۶۹ء کو شہر دہلی میں ہوئی۔ مدفن بستی نظام الدین اولیا کے علاقے میں ہوئی۔

اب سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کا کلام اپنے استاد مرزا غالب دہلوی کے ردیف، قافیہ اور مضمون کے ضمن میں ملاحظہ ہو۔ یہ کلام صفیر یادگاری ہی نہیں لائق مکالمہ ہے۔ ان اشعار میں معانی اور لطف شعری کے سوا لطف زبان اور شگفتگی بھی ہے۔ افسوس اس امر کا ہے کہ صفیر کو لائق اعتنا نہ خیال کیا گیا۔ اردو ادب میں جو درجہ ان کا ہو سکتا تھا اس کا تعین نہ کیا گیا۔ انھیں بہار اور اتر پردیش کے اہل علم حضرات نے نظر انداز کیا، البتہ بنگال کی ایک یونیورسٹی کے طالب علم نے قدردانی کی اور مقالہ لکھ کر ان کی اشک شوئی کی۔ بہرکیف غالب دہلوی کی درج بالا غزل کی ردیف و قافیہ اور بحر میں ان کے شاگرد صفیر بلگرامی کا غیر مطبوعہ کلام ملاحظہ کریں:

آہ اب ہونٹوں پر نہیں آتی
باستہ دل کی خبر نہیں آتی
تم رلاتے ہو تو میں روتا ہوں
خود بخود آنکھ بھر نہیں آتی
کس طرح ہوگا وصل مرے اللہ
کوئی صورت نظر نہیں آتی
ہائے وہ لب ہلا کے رہ جانا
ابھی کچھ بات کر نہیں آتی
ایک میری خبر ہے بس مفقود
شہر میں کیا خبر نہیں آتی
وہ نہ آئیں تو اختیار ہے کیا؟
موت بھی تو ادھر نہیں آتی
نہ سہی ہو حکومت ان پہ صفیر
چاہ بھی تم کو کر نہیں آتی

استاد اور شاگرد کی اس غزل میں انداز تفکر نرالا ہے۔ صفیر کے یہاں بھی طنز کے تیر اور انداز نرالے نظر آتے ہیں، مثلاً یہ شعر:

تم رلاتے ہو تو میں روتا ہوں
خود بخود آنکھ بھر نہیں آتی

یا یہ شعر:

ایک میری خبر ہے بس مفقود
شہر میں کیا خبر نہیں آتی

صفیر بلگرامی کے یہاں مشکل بیان اور انداز کلام کو خاص دخل ہے۔ سہل ممتنع کا رواج بھی کثرت سے ان کے یہاں ملے گا، مثلاً یہ شعر

کل جو اٹھتے تھے بٹھانے کے لیے
آج بیٹھے ہیں اٹھانے کے لیے

یہ شعر اب سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پرانا ہے مگر آج کی آواز اور وطیرہ لگ رہا ہے۔ کیا موجودہ روش ایسی ہی نہیں ہے؟ کساد بازاری نے شرفا کو بدتر اور کم تر افراد کو شہرت یافتہ نہیں بنا رکھا ہے؟ تم زمانہ اسی کا نام ہے مگر شاعر کی زبان اور خیال کی یکسانیت لائق داد ہے۔ یہ شعر بھی اسی کی مثال ہے

قصہ ہمارا تم سے سنا بھی نہ جائے گا
تم کیا سنو گے، ہم سے کہا بھی نہ جائے گا

زبان کی ہمہ دانی اور فکر و فن کا اندازہ یہ شعر کیے جانے کے لائق ہے:

کیا پوچھنا تمھاری سخن دانی کا یہ شعر
ترکیب با مذاق ہے اللہ یا مرزا

صفیر بلگرامی کی تخلیقات کی جو تعداد محققین و ادبا نے تحریر کی ہیں ان سے الگ محققانہ طور پر ڈاکٹر ظفر اوگانوی نے جو فہرست کتب صفیر بلگرامی کی پیش کی ہے وہ لائق سند ہے اور اسے ہی تسلیم کرنا مناسب ہے۔ ویسے بیشی و کمی ممکنات کی بات ہے، مثلاً راقم کے پاس صفیر بلگرامی کی دست و قلم کی جو مخطوطہ ہے وہ خود ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے، اس کی اگر طباعت ہو جائے تو بہت سے نئے گوشے سامنے آ سکتے ہیں، پھر وہ تحریر صفیر کے دست و قلم کی یادگار ہے اور اہم ہے۔

راقم نے صفیر بلگرامی کی ایک نادر و نایاب تحریر 'تاریخ بلگرام' جو کسی اردو کے محقق اور ادیب کی نظر سے نہیں گزر سکی تھی، اگرچہ وہ کتاب خود صفیر بلگرامی کی حیات میں شائع ہو چکی تھی مگر کسی کتب خانہ، کسی اہل خاندان کے پاس اس کا نسخہ نہ رہا۔ خود قاضی عبدالودود نے تحریر فرمایا تھا کہ یہ نسخہ 'تاریخ بلگرام' کا میری نظر سے نہیں گزرا ہے اور نہ ہی خدا بخش لائبریری یا کسی کتب خانے میں ہے۔ بہرکیف راقم نے تاریخ بلگرام۔ تذکرہ... حصہ اول و دوم کی اشاعت جدید کرا دی ہے، اس پر مقدمہ ڈاکٹر حنا عباس رضوی صاحب اور تاریخ بلگرام پر مقدمہ پروفیسر مختار الدین احمد آرزو صاحب کا ہے۔ ان کے ایک اہم علمی کام اور بھی انجام پایا ہے کہ راقم نے 'اکابر بلگرام' کے نام سے دو حصوں میں قدیم اہل بلگرام کے حالات و واقعات سن و جہت دے کر شائع کرا دیا ہے۔ اس تالیف میں قدیم اکابر کے سوا جدید افراد کو بھی شریک کتاب کر دیا ہے۔ ان تالیفات پر پروفیسر کبیر احمد جائسی اور پروفیسر عبدالرحیم قدوائی صاحب نے مقدمات تحریر فرما کر قدردانی کی ہے، جس سے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے۔ اس

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

اردو دُنیا

دہلی کا ایک اور اردو میڈیم اسکول ہندی میں تبدیل

ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ نے قریش نگر گرلز سینئر سیکنڈری اسکول میں خاموشی سے اردو میڈیم کو ختم کر دیا

نئی دہلی (۳۰؍مارچ)۔ دہلی سرکار کے ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ نے بہت خاموشی کے ساتھ ایک اور اردو میڈیم اسکول کو ہندی میڈیم میں تبدیل کر دیا اور اس سلسلے میں پہلے سے کوئی نوٹس جاری نہیں کیا گیا اور نہ ہی طالبات اور ان کے والدین کو کوئی اطلاع دی گئی۔ اتنا ہی نہیں، اسکول کی مینجمنٹ کمیٹی کے ممبران سے بھی منظوری نہیں لی گئی۔ یہ بات ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ کی ویب سائٹ پر اردو میڈیم اسکولوں کی فہرست دیکھنے سے پتا چلی، جہاں سے قریش نگر گرلز سینئر سیکنڈری اسکول کا نام ہٹ چکا ہے۔ دہلی سرکار کے ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ کے ذریعے قریش نگر گرلز سینئر سیکنڈری اسکول سے خاموشی کے ساتھ اردو میڈیم کو ختم کر دیا گیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسکول میں اب ایک بھی اسٹاف اردو جاننے والا نہیں ہے۔ اس وقت جو اسٹاف اسکول میں کام کر رہا ہے ان میں ریتو کپور (پی ای ٹی)، سریتا گپتا (ٹی جی ٹی سوشل سائنس)، ویریندر سنگھ (لیب اسسٹنٹ)، ارمیلا ٹھاکر (ٹی جی ٹی [illegible])، سریتا سینی (ڈرائنگ ٹیچر)، ٹی جی ٹی (میتھ)، منجو رانی (لائبریرین)، سیما کماری کھروار (ٹی جی ٹی ہندی)، سیما سینی (وائس پرنسپل)، رتو بھٹناگر (ٹی جی ٹی میتھ) اور تسلیم کماری بھٹ گریڈ تھرڈ (یو ڈی سی) شامل ہیں اور ان میں سے کوئی بھی اردو سے واقف نہیں ہے۔ اس معاملے میں مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ اس پورے معاملے میں اسکول کی پرنسپل کی سازباز بھی شامل ہے اور انھوں نے سب کو اندھیرے میں رکھا۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' نے اسکول کی پرنسپل سیما سینی سے کئی بار رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ملی۔ اسکول سے جواب دیا جاتا رہا کہ وہ میٹنگ میں ہیں اور گھر پر ان کا موبائل ہر بار ان کے شوہر اٹھاتے رہے اور یہی جواب ملا کہ میڈم کسی کام سے باہر گئی ہیں۔ اس معاملے کے سامنے آنے کے بعد نوائے حق ایسوسی ایشن کے صدر اور آر ٹی آئی کارکن اسد غازی نے ایجوکیشن ڈائرکٹوریٹ میں آر ٹی آئی داخل کر کے اس اسکول کے متعلق سے کئی سوالات کے جواب مانگے ہیں۔ آر ٹی آئی میں سوال کیا گیا ہے کہ کیا گورنمنٹ گرلز اسکول قریش نگر کو ہندی میڈیم میں تبدیل کر دیا گیا ہے؟ اگر ہاں تو مہربانی کر کے اس سے متعلق کارروائی کاپی عنایت فرمائیں۔ اسکول میں 12 افراد کے اسٹاف میں سے کتنے لوگوں نے دسویں جماعت تک بطور مضمون اردو کی تعلیم حاصل کی ہے؟ اسکول کی پرنسپل سیما سینی اردو نہیں جانتیں۔ مہربانی کر کے وہ فارمولا یا منصوبہ پیش کیا جائے جس سے ہندی میڈیم کا یہ اسٹاف اردو میڈیم کی طالبات کو تعلیم دے رہا ہے۔ مہربانی کر کے ان افسران کے ناموں کی لسٹ بھی فراہم کرائی جائے جنھوں نے اردو میڈیم اسکول میں تمام غیر اردو داں اسٹاف کا تقرر اور تبادلہ کیا ہے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

تلنگانہ میں اردو کی حیثیت دوسری سرکاری زبان کی ہوگی

کریم نگر (۱۰؍مارچ)۔ مرکزی وزیر جے رام رمیش نے آج کہا ہے کہ علاحدہ ریاست تلنگانہ اور باقی آندھرا پردیش میں مسلمانوں کے تحفظات کو قانونی شکل دینے کے اقدام کیے جائیں گے اور اقلیتوں کے مفادات کا ہر صورت میں تحفظ کیا جائے گا۔ دفتر ضلع کانگریس کمیٹی میں میڈیا کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے جے رام رمیش نے کہا کہ ریاست تلنگانہ کا پہلا چیف منسٹر دلت یا پس ماندہ طبقے سے ہوگا اور خوشامد پسند لیڈروں کو اہم عہدوں سے دور رکھا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ ریاست تلنگانہ کے تمام اضلاع میں اردو کی یہ حیثیت دوسری سرکاری زبان عمل آوری کے عملی اقدام بھی کیے جائیں گے۔

(اعتماد۔ حیدرآباد)

اردو اسکولوں میں کتابوں کی عدم دستیابی کا مسئلہ ہنوز جاری

ڈھائی ماہ کا عرصہ گزرنے کے باوجود کتابیں فراہم کرنے کا وعدہ جھوٹا نکلا

کولکاتا (۱۷؍مارچ)۔ حق تعلیم ایکٹ ۲۰۰۹ء کے تحت ۶ سے ۱۴ سال تک کے بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے لیکن ریاستی محکمہ تعلیم اس ایکٹ کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔

نئے تعلیمی سال کو ڈھائی ماہ سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے مگر اردو میڈیم اسکولوں میں نصابی کتابوں کی عدم دستیابی کا سلسلہ بدستور جاری ہے جس سے طلبہ کی پڑھائی متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ امتحانات پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔

اردو میڈیم اسکولوں میں چھٹی جماعت میں انگریزی، ریاضی، ساتویں جماعت میں انگریزی، ریاضی، آٹھویں جماعت میں صرف انگریزی کی کتاب دستیاب ہے جو نامکمل اور ناکافی ہے نیز یہ کہ بقیہ کتابیں کب تک ملیں گی اس سے اسکول کے اساتذہ بھی لاعلم ہیں۔

واضح ہو کہ گزشتہ ۳۱؍جنوری کو مغربی بنگال بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن کے ایڈمنسٹریٹر نے بتایا تھا کہ بنگلہ کتاب سے اردو میں ترجمہ کرنے کے باعث کتابوں کی اشاعت میں تاخیر ہوئی ہے اس لیے چند کتابوں کی ترتیب دی گئی تھی تاکہ اسکولوں میں پڑھائی شروع کر دی جائے مگر دو مہینے سے زائد کا عرصہ گزر جانے کے باوجود کتابوں کی ترتیب کا کام باقی ہے۔ اس سلسلے میں اردو میڈیم اسکولوں کے اساتذہ سے بات چیت کرنے پر انھوں نے بتایا کہ کتابوں کی عدم دستیابی سے بچوں کی تعلیم پر اثر پڑ رہا ہے اور وہ سالانہ امتحانات میں بہتر مارکس حاصل کرنے میں ناکام ہوں گے۔ اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو بیشتر گارجین اپنے بچوں کو اردو میڈیم اسکولوں میں داخلہ کرانے سے گریز کریں گے۔

(آبشار۔ کلکتہ)

قطب اللہ پور میں اردو میڈیم جونیر کالج کے قیام کی یقین دہانی

حیدرآباد (۳؍مارچ)۔ قطب اللہ پور اسمبلی حلقے میں واقع گاندھی نگر کے سرات گارڈن فنکشن ہال میں منعقدہ مائناریٹی سیل کانگریس کمیٹی کے زیر اہتمام اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ہنمنت ریڈی نے کہا کہ قطب اللہ پور اسمبلی حلقے میں جتنی ترقی ہونی تھی نہیں ہو سکی جس سے مقامی ایم ایل اے کی عدم دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ مائناریٹی سیل کانگریس کمیٹی کے چیئرمین محمد رشید نے جناب کے ایچ آر سے نمائندگی کی کہ قطب اللہ پور میں اردو میڈیم کالج کے قیام کی ضرورت ہے جس پر انھوں نے یقین دلایا کہ وہ اس ضمن میں ضروری اقدام کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ ڈویژن میں ایک اردو میڈیم پرائمری اسکول بھی قائم کیا جائے گا۔

(اعتماد۔ حیدرآباد)

اردو کو ذریعۂ تعلیم یا لازمی مضمون کے طور پر اختیار کرنے کی ضرورت

حیدرآباد (۹؍مارچ)۔ جناب زاہد علی خاں (ایڈیٹر روزنامہ 'سیاست') نے اردو والوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے بچوں کو مادری زبان میں تعلیم دلوائیں۔ اگر اردو ذریعۂ تعلیم میں انھیں مشکلات پیدا ہو رہی ہیں تو کم از کم اردو کو لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائیں۔ اس طرح ہم اپنی زبان اور تہذیب کو زندہ رکھ سکتے ہیں۔ جناب زاہد علی خاں کل شام اردو ہال حمایت نگر میں ہفتہ وار 'آئینہ چشم' کی تیسویں سالگرہ کی تقریب سے خطاب کر رہے تھے۔ جناب عابد رسول خاں (صدرنشین اقلیتی کمیشن آندھرا پردیش) نے کہا کہ ریاست کے تمام سرکاری اسکولوں میں اردو مادری زبان کے طلبہ و طالبات کے لیے لازمی طور پر اردو تدریس کا انتظام کیا جائے۔ جناب عابد صدیقی نے حکومت پر زور دیا کہ وہ اردو کے چھوٹے اخبارات کو زیادہ سے زیادہ اشتہارات جاری کرے کیوں کہ یہ اخبارات عوام میں کافی مقبول ہیں۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

ڈاکٹر شمیم احمد، یوپی اردو اکادمی کے سکریٹری مقرر

لکھنؤ (۷؍مارچ)۔ یوپی اردو اکادمی میں حکومت نے نئے سکریٹری کی تقرری کر دی ہے۔ ڈاکٹر شمیم احمد نے اردو اکادمی میں اپنا عہدہ سنبھال لیا اور اپنے عہدے سے متعلق کام انجام دینا شروع کر دیا ہے۔ وہ اردو اکادمی میں بطور سکریٹری آنے سے قبل ہردوئی میں میڈیکل آفیسر کے بطور تعینات تھے۔ مجلس انتظامیہ کے صدر ڈاکٹر نواز دیوبندی نے اکادمی میں ڈاکٹر شمیم احمد کا خیر مقدم کیا اور امید ظاہر کی کہ ان کے آ جانے سے اکادمی مزید فعال ہوگی۔ یاد رہے کہ اس سے قبل حکومت کی طرف سے ایک غیر اردو داں افسر کی تقرری بطور سکریٹری کی گئی تھی جس پر اکادمی کے صدر نے اعتراض کیا تھا، چناں چہ انھیں واپس ہونا پڑا۔

(آبشار۔ کلکتہ)

شمس آباد اردو میڈیم اسکول ہیڈ ماسٹر سے محروم

حیدرآباد۔ جناب محمد مشتاق محی الدین (صدر مسلم ویلفیئر ایسوسی ایشن تلنگانہ) نے کہا کہ مسلمانوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا اور مسلم سماج کو جہالت سے بچانا ہماری ذمے داری ہے، اس لیے مسلم ویلفیئر ایسوسی ایشن کی جانب سے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر رنگاریڈی سے تحریری نمائندگی کی گئی کہ وہ شمس آباد اردو میڈیم پرائمری اسکول میں ہیڈ ماسٹر کا تقرر جلد سے جلد کریں تاکہ اردو میڈیم اسکول میں طلبہ و طالبات کو حصول علم میں آسانی ہو اور اسکول میں موجود مسائل کو حل کرنے میں مدد ملے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

اردو سائن بورڈ کی تصحیح ہوگئی

سیلم، کرناٹک (۱۰؍مارچ)۔ سیلم میں ریلوے کی جانب سے سائن بورڈ اردو میں بھی آویزاں کیے گئے مگر جس میں بعض الفاظ کی غلطیاں تھیں مثلاً دوجے کی جگہ اعلا لکھا ہوا تھا، اس کے علاوہ بعض حروف حذف کیے گئے تھے۔ اس پر سیلم کے اردو صحافیوں کا ایک وفد جس میں نبین احمد خاں، عبدالغفار، جاوید فریدی اور دلشاد نے ریلوے اسٹیشن ماسٹر منتوش جاوہ سے ملاقات کر کے اس کی طرف ان کی توجہ دلائی جس پر انھوں نے اس غلطی کو درست کرنے کی بات کہی۔ دوسرے دن وہ غلطیاں درست کر لی گئیں۔ اس پر تمام صحافیوں نے اسٹیشن ماسٹر اور محکمہ ریلوے کا شکریہ ادا کیا۔

(سالار۔ بنگلور)

گرامی نامے

ادارے کا مراسلہ نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے

اسیم کاویانی کا مضمون 'تقسیم ہند کے پس منظر میں تین اہم کردار'

محترمی! ہفت روزہ 'ہماری زبان' کے لگاتار تین شماروں (۱۱-۱۸) میں اسیم کاویانی کا طویل مضمون 'تقسیم ہند کے پس منظر میں تین اہم کردار' شائع کرکے آپ نے بڑا کام کیا ہے۔ نئی نسل کو مولانا آزاد، سردار پٹیل اور محمد علی جناح کے متعلق کچھ نہ کچھ علم تو ہے، لیکن یہ مضمون اپنی سلاست، سادگی اور افادی پہلو کے ساتھ ان تین اہم کرداروں کے متعلق نوجوان قاری کو خاص معلومات فراہم کرے گا۔

رؤف خیر کا مضمون 'اچھی نثر کی خصوصیات' بھی نئے لکھنے والوں کے لیے (اور کچھ کہنہ مشق اہل قلم کے لیے بھی) بہت مفید اور معاون ثابت ہوگا۔

اقبال انصاری
17B-1-F، پانڈو نگر، پٹپڑ گنج روڈ
دہلی- 110091

یو پی ایس سی سے عربی و فارسی کو ہٹانا بڑی ناانصافی

فیصلے پر دوبارہ غور کیا جائے: مولانا اسرار الحق قاسمی

کلکتہ (۲۴ فروری)۔ اس استدلال کے ساتھ کہ عربی اور فارسی غیر ملکی زبانیں نہیں بلکہ دونوں کا ہندستان سے متعلق مکمل تاریخ ہے۔ مولانا اسرار الحق قاسمی نے یو پی ایس سی سے عربی و فارسی زبان کو ہٹانے کو ایک بڑی ناانصافی قرار دیا اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ اس فیصلے پر دوبارہ غور کیا جائے۔ مولانا قاسمی نے کلکتہ یونیورسٹی میں 'ہندستان میں عربی و فارسی کی شاعری' کے عنوان سے دو روزہ سیمینار کے افتتاحی سیشن میں واضح لفظوں میں کہا کہ عربی و فارسی کو غیر ملکی زبان قرار دینے والے ہندستانی تہذیب و ثقافت سے ناواقف ہیں۔ چوں کہ تاریخ خالی نہیں جاتی ہے بلکہ سچی ہے اس لیے ہندستان کی تاریخ بھی یہی ہے کہ یہاں کی زبانوں اور کلچر نے عربی و فارسی زبان سے استفادہ کیا ہے۔ مولانا نے کہا کہ آج اگر اردو زبان کو شیریں زبان کا درجہ دیا جاتا ہے تو وہ بھی عربی و فارسی کی دین ہے۔ تاریخ اور قرآنی آیات کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے یہ بھی بتایا کہ عربی و فارسی زبان بولنے والے ہندستان میں تین ہزار سال قبل سے آباد ہیں۔ ان دونوں زبانوں نے ہندستانی زبانوں کو نقصان پہنچانے کے بجائے انھیں تہذیبی سطح پر مالا مال کیا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر رنجن داس نے اپنے افتتاحی خطاب میں کہا کہ ہندستانی زبانیں اور تہذیب و کلچر نے ان دونوں زبانوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ہندستان کی تہذیب اور کلچر میں ان دونوں زبانوں کے اثرات موجود ہیں۔ پروفیسر رنجن داس نے یہ بھی اعلان کیا کہ کلکتہ یونیورسٹی کے زیر انتظام ان دونوں زبانوں کے فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ انھوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ اس طرح کے موضوعات پر مستقبل میں بھی سیمینار منعقد کیے جائیں گے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر اور اردو اکیڈمی مغربی بنگال کے چیئرمین منال شاہ القادری نے کہا کہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا انسانی فطری حق ہے اس حق سے محروم کیا جانا حقوق انسانی کے خلاف ہے۔ ان دونوں زبانوں نے اس ملک کی تعمیر میں کافی اہم رول ادا کیا ہے۔ منال شاہ القادری نے کہا کہ ہندستان میں ایسے کئی شعرا ہیں جنھوں نے اپنی زبان فارسی و عربی کو منتخب کیا۔ خسرو ہندستانی تھے مگر ان کی شاعری فارسی میں تھی۔ ان کی شاعری سے آج بھی ہندستان کی تمام زبانیں استفادہ کرتی ہیں۔

(حالات بنگلور)

ہائر سکنڈری امتحانات میں
اردو پیپر میں چار سوالات نصاب سے باہر کے دیے گئے

کولکاتا (۱۳ مارچ)۔ ہائر سکنڈری امتحانات (10+2) کورس کا پہلا دن اس طور پر پرامن گزرا کہ اردو کے طلبہ نے باوجود چار سوالات آؤٹ آف سلیبس (نصاب) کے آنے کے باوجود کوئی احتجاج نہیں کیا جب کہ اس کے خلاف زبردست احتجاج کرنے کی ضرورت تھی۔ پتا نہیں کہ ریاستی وزارت تعلیم ایسے اردو والوں کو سوالات سیٹ کرنے کا موقع کیوں دیتی ہے جنھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ کون سا باب نصاب میں شامل ہے اور کون سا نہیں۔ ہر سال کی طرح امسال بھی اردو طلبہ کے ساتھ مذاق اور ان کے کیریئر سے کھلواڑ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر نصاب سے باہر کے سوالات ہندی اور بنگلہ زبان کے پیپر میں آتے تو اس وقت بھی ٹی وی چینلوں پر اس کا چرچا ہوتا اور حکومت کو اس سلسلے میں بیان دینے کے لیے سامنے آنا پڑتا لیکن یہاں تو مدعی سست گواہ چست والا معاملہ ہے۔ جب کہیں سے کوئی آواز ہی نہ نکلے تو پھر احتجاج کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور حیرت اس بات پر ہے کہ پوری ریاست میں کہیں سے بھی آواز نہیں اٹھی کہ اردو کے پیپر میں چار اہم سوالات آؤٹ آف سلیبس ہیں جو حسب ذیل ہیں:

(۱) سوال نمبر ۵ کا ۳: کیفی اعظمی کا چراغ۔ (۲) سوال نمبر ۵ کا ۴: اقبال کی نظم ہمالہ کی تشریح۔ (۳) سوال نمبر ۶ کا ایک: نظم ہمالہ میں اقبال نے کن خیالات کا اظہار کیا۔ (۴) سوال نمبر ۷ کا ۴: بحیثیت شاعر کیفی اعظمی کی شاعری کا محاسبہ۔

واضح رہے کہ یہ چاروں سوالات سلیبس سے باہر کے ہیں۔ کیفی اعظمی سلیبس میں شامل نہیں۔ اقبال کی نظم بزم اور قدرت ہے، ہمالہ نہیں، لیکن ان کو سلیبس میں شامل نہ کیے جانے کے باوجود اردو طلبہ کو گمراہ کرنے کی سازش رچی گئی۔

(آبشار، کلکتہ)

اک دیا اور بجھا

لکھنؤ۔ اردو کے مشہور، ممتاز ادیب، شاعر، نقاد اور دانشور پروفیسر محمود الٰہی کا ۱۹ مارچ ۲۰۱۴ کو مختصر علالت کے بعد لکھنؤ میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۸۴ برس تھی۔ وہ ۳ دسمبر ۱۹۳۰ کو ٹانڈہ، فیض آباد (اب امبیڈکر نگر) میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے گورکھپور یونیورسٹی میں شعبہ اردو قائم کیا اور اس کے صدر کے عہدے سے ۱۹۹۰ء میں سبکدوش ہوئے۔ ان کی نگرانی میں ملک کی متعدد مشہور و معروف شخصیات نے تحقیقی کام مکمل کرکے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی جو آج بھی ملک کے مختلف اداروں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ممتاز شاعر مجروح سلطانپوری ان کے درس گاہی کے ساتھی تھے۔ پروفیسر محمود الٰہی نے متعدد کتب تصنیف کیں، جن میں اردو میں قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، فسانۂ عجائب کا بنیادی متن، اردو کا پہلا ناول 'خط تقدیر' کی بازیافت، افادات مہدی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر محمود الٰہی تین مدت تک اترپردیش اردو اکادمی کے چیئرمین رہے۔ انھوں نے اکادمی کے چیئرمین رہتے ہوئے اکادمی کی دیگر اشاعت کو فروغ دینے کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد کے معرکہ آرا اخبار 'الہلال' اور 'البلاغ' کو تدوین اور ترتیب دے کر کتابی شکل میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ مولانا آزاد کے یوم پیدائش کی صد سالہ تقریبات کے تحت انھوں نے ملک بھر کے مشاہیر قلم کاروں سے 100 کتب تحریر کرا کے انھیں اکادمی سے شائع بھی کرایا۔ پروفیسر محمود الٰہی بہت نیک اور سادہ انسان تھے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

○

نامور عالم دین اور معروف اردو اسکالر مولانا عاصم القادری بدایونی ۳ مارچ ۲۰۱۴ کو عراق کی راجدھانی بغداد میں دہشت گردوں کی گولی کا نشانہ بن کر ہلاک ہوگئے۔ مرحوم بدایوں کے معروف شیخ عثمانی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ یہ اطلاع جناب تسلیم غوری بدایونی نے دی ہے۔ مولانا عاصم القادری کی پیدائش ۶ مئی ۱۹۷۵ کو بدایوں میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم اپنے خاندانی مدرسے مدرسہ عالیہ قادریہ بدایوں میں حاصل کی۔ اعلا دینی تعلیم کے لیے ان کے والدین نے ان کو جامعہ الازہر مصر بھیجا جہاں سے انھوں نے تفسیر علوم قرآن اور منطق کی اعلا ڈگریاں حاصل کیں اور بدایوں واپس آکر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے علوم اسلامیہ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور تدریس، تبلیغ، تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگئے۔ انھوں نے خانقاہ قادریہ بدایوں سے وابستہ بزرگوں کی قدیم و جدید کتب کو جدید طور پر شائع کرایا جس کی تعداد تقریباً ۳۰ ہے۔ 'قرآن کریم کی سائنسی تفسیر ایک تنقیدی مطالعہ'، 'تیرآبادیات' اور 'عربی محاورات مع ترجمہ و تعبیرات' مولانا کے قلمی شاہکار ہیں۔ مولانا نے مشہور زمانہ کتاب تذکرہ نوری اور اکمل التاریخ کو بھی جدید طور پر شائع کرایا۔

مولانا عاصم القادری ۲۰ فروری ۲۰۱۴ کو اپنے والد ماجد اور برادر اصغر مولانا عطیف میاں کے ساتھ پچاس رکنی وفد لے کر عراق و مصر میں واقع درگاہوں پر حاضری کے لیے گئے تھے۔ ۲۶ فروری کو ہی عراق پہنچے تھے جہاں انھوں نے متعدد تقریبات میں حصہ لیا۔ ۳ مارچ کو کسی تقریب میں حصہ لینے کے لیے جارہے تھے کہ دہشت گردوں کی گولی کا نشانہ بنے اور جاں بحق ہوگئے۔ تدفین ۶ مارچ ۲۰۱۴ کو بغداد میں ہی عمل میں آئی۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

مولانا عاصم القادری کی وفات پر تعزیتی جلسہ

بدایوں (پریس ریلیز)۔ نامور عالم دین اور معروف اسکالر مولانا عاصم القادری بدایونی کی ۳ مارچ ۲۰۱۴ کو عراق کے شہر بغداد میں دہشت گردوں کی گولی سے ہوئی موت پر ایک تعزیتی جلسہ اردو کے معروف محقق اور نقاد ڈاکٹر شمس بدایونی کی صدارت میں حامد میموریل لائبریری بدایوں میں ۱۵ مارچ کو منعقد کیا گیا جس میں ادبی، سیاسی اور سماجی شخصیات نے شرکت کی اور مولانا کی اچانک وفات پر غم و دکھ کا اظہار کیا۔

ڈاکٹر شمس بدایونی نے مولانا کی وفات پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان جیسا سیکولر ذہن رکھنے والا عالم صدیوں کی الٹ پھیر کے بعد پیدا ہوتا ہے، ہم نے ایک بیش قیمت ہیرا کھو دیا ہے۔

ڈاکٹر مسرت اللہ خاں اشرفی نے مولانا عاصم میاں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے کم عمری میں وہ ادبی کارنامے انجام دیے جو بڑے بڑے لوگ انجام نہ دے سکے۔

حاجی ولی اللہ خاں صاحب نے مولانا کی وفات کو بدایوں کا عظیم نقصان قرار دیا جب کہ حامد میموریل لائبریری کے سکریٹری جناب تسلیم غوری بدایونی نے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ عاصم میاں جیسا مفکر اور مفسر قرآن اب دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔ ان کی تقریریں اور تحریریں انسان دوستی اور امن و آشتی کا پیغام دیتی تھیں، مگر دہشت گردوں نے ان کو بھی نہیں بخشا۔ تسلیم غوری نے مولانا کی وفات کو اپنا ذاتی نقصان بتایا۔

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : سب کے لیے
مولف : ابن غوری
ضخامت : ۱۹۲ صفحات
قیمت : ۱۳۰ روپے
ملنے کا پتہ : ہدیٰ بک سینٹر
پرانی حویلی، حیدرآباد-۲
تبصرہ نگار : ڈاکٹر رفیعہ حامد

ابن غوری کئی کتابوں کے مصنف اور مولف ہیں۔ ان کو تعلیم و تعلم سے دلی شغف ہے۔ ابن غوری کا مطالعہ بہت وسیع ہے، دوران مطالعہ ان کو جو بات بہت اچھی لگی کہ اس کو دوسروں تک پہنچایا جائے، انھوں نے اس کو اپنے پاس نقل کرلیا۔ اپنے پیش لفظ میں ابن غوری لکھتے ہیں:

''ہم نے اپنے آشیانے کے لیے
جو چپکے دل میں وہی تنکے لیے
تعمیر کا تو خیال بھی نہیں تھا لیکن
(دوران مطالعہ) ایسے چبھنے والے
تنکے پسند آتے رہے اس لیے انھیں
جمع کرتا رہا۔ ایک عرصہ بعد دیکھا تو
ایک ڈھیر سا نظر آیا۔ اب تو جی للچایا
کہ تھوڑا سا آشیانہ تعمیر کرنا ہی چاہیے،
پس یہ ہوگیا۔ اس کا نام رکھا 'سب
کے لیے' آپ بھی قدم رنجہ
فرمایئے۔ محسوس ہوگا کہ اس کی فضا
دلکش اور روح افزا ہے''۔

ابن غوری نے اس کو ۱۴ عنوانات میں تقسیم کیا ہے اور پانچ باب بنائے ہیں (۱) زندگی کی جھلکیاں۔ اس کے ذیلی عنوانات میں علاوہ صوفیا، قائدین و مصلحین، ادیب و شاعر و صحافی اور فنکار، اساتذہ، طلبہ وغیرہ ہیں۔ دوسرے باب کا عنوان مشاہیر سے سوالات اور ان کے جوابات ہے۔ ان مشاہیر میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، پروفیسر عبدالوہاب بخاری جیسے علما بھی شامل ہیں۔

تیسرا باب شخصیت کا انوکھا تعارف ہے۔ حضرت علیؓ کے تعارف کے ذیل میں لکھا ہے:

ایک شیعہ شاعر 'شاکر ناجی' نے حضرت علیؓ کے نام کا ہجے اس طرح کہا:

محبت سوں 'علی' کی اب تو ناجی
دل ہوا ہے 'حیدرآباد'

اس میں کئی علما و مشائخ، ادیبوں و شاعروں کا تعارف شامل ہے۔ اس کے بعد والا باب کتابوں کی دنیا کے عنوان سے مختص ہے۔ سب سے پہلے قرآن پاک کے بارے میں لکھا ہے۔ کئی دینی کتابوں کے متعلق ایک سطر، ایک جملہ یا ایک پیرا میں تعارف کیا گیا ہے۔ ابن صفی نے اپنی کتاب جاسوسی دنیا کے متعلق کہیں لکھا تھا ان کا یہ جملہ یہاں درج ہے: ''میری کتابیں چاہے الماریوں کی زینت نہ بنیں لیکن تکیے کے نیچے ضرور پائی جاتی رہیں گی''۔

کتاب کے آخر میں نایاب اقوال درج ہیں جس کا تعارف اس شعر سے ہوتا ہے:

بات ہر بات کو نہیں کہتے
بات مشکل سے بات ہوتی ہے

کل ۹۵ اقوال شامل اشاعت ہیں، ان میں مولانا علی میاں، مفتی محمود گنگوہی، رشید الدین خاں، سبھاش چندر بوس، گاندھی جی، حکیم محمد سعید شہید اور علامہ سید سلیمان ندوی کے اقوال زریں شامل کیے گئے ہیں۔

حرف آخر کے تحت سورہ آل عمران کی موت سے متعلق آیت درج ہے اس کے بعد انشاء اللہ خاں انشا کا مشہور شعر:

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

کتاب کو ایک مرتبہ ہاتھ میں لینے کے بعد پوری ختم کیے بغیر ہاتھ سے رکھنا بڑا جوکھم کا کام ہے۔ ابن غوری نے بہت اچھا تحفہ سب کو دیا ہے۔ آپ بھی ایک مرتبہ پڑھ کر دیکھیے۔ صاف ستھری خوب صورت ٹائٹل کور کے ساتھ دیدہ زیب چھپی ہے۔

○○

نام کتاب : حاضر غائب
مصنف : اشتیاق سعید
ضخامت : ۱۳۳ صفحات
قیمت : ۱۵۰ روپے
ناشر : نیو ٹاؤن پبلشرز
۱۱/۱/۱۷-اے، عائشہ منزل
پنچ پیر روڈ، کرلا، ممبئی-۷۰
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

'حاضر غائب' اشتیاق احمد (قلمی نام اشتیاق سعید) کی تیسری کتاب ہے جو حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے۔ اس سے پہلے 'انقلاب مرد وبعد' (ڈرامہ) اور 'تل جوتا' شائع ہوچکی ہیں۔ ۲۳ رمئی ۱۹۶۳ء کو منہاج پور، اعظم گڑھ میں جنے اشتیاق سعید نے ممبئی کو اپنا مستقر بنایا جہاں وہ تجارت کے علاوہ بالی ووڈ سے بطور رائٹر اور ہدایت کار منسلک ہیں۔ مذکورہ مجموعے میں ۲۲ افسانے شامل ہیں جن کے بارے میں مشہور نقاد اور ماہر جمالیات شکیل الرحمٰن فرماتے ہیں کہ ''جمالیاتی نقطۂ نظر سے یہ بات اہم ہے کہ اشتیاق سعید کڑوی سچائی کو تخلیقی سطح پر اپنے گہرے مشاہدے سے روشن کرتے ہوئے کھردرے پن کی نغمگی اور لیرک (lyric) کو احساس اور جذبے سے ہم آہنگ کردیتے ہیں''۔

اشتیاق سعید کے یہاں حقیقت نگاری صاف طور پر نظر آتی ہے۔ وہ اکثر نفسیاتی اور جنسیاتی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں۔ عبرت مچھلی شہری نے اپنے مضمون میں انھیں ''گاؤں کی مٹی کا افسانہ نگار'' بتایا ہے۔ شاید یہ بات ان کے پہلے افسانوی مجموعے 'تل جوتا' (جو میری نظر سے نہیں گزرا ہے) کے حوالے سے صحیح ہو مگر زیر نظر مجموعے کے سبھی افسانے باسوا ایک کے ممبئی شہر خاص کر بالی ووڈ سے متعلق ہیں۔ گاؤں کے حوالے سے ایک بہت ہی دل چسپ اور قاری کو مضبوط گرفت میں لینے والا افسانہ 'فرنگی' حاصل مجموعہ ہے جو عبرت کے مضمون کی تائید کرتا ہے۔ اپنے آبائی گاؤں کا نقشہ اور بچپن کے دوست کی روح سے ساتھ افسانے کو شاہکار بناتا ہے۔ اکثر افسانے جنسی موضوعات پر تحریر کیے گئے ہیں جیسے بعید از قیاس' جس میں ادھیڑ عمر کی محروم جنسی (sex starved) عورت کثیر شہوتی (nymphomania) کی عادی ہوجاتی ہے یہاں تک کہ اپنے ہی داماد سے تعلق بڑھا کر اپنی بیٹی کا گھر برباد کرتی ہے۔ اس افسانے میں موجودہ معاشرے کی ایک اور بڑا المیہ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے حرص دولت کی خاطر نوجوانوں کا اپنی بیوی کو بالکل فراموش کرکے خلیج میں نوکری کرنے جانا۔ 'بھوک' کشمیر کو بنگال بنادیتی ہے' میں بھی پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے شگفتہ کا شوہر اس کے حسن کو تیاگ کر خلیج میں نوکری کرنے چلا جاتا ہے۔ 'چوہر پر سوز' کہانی ہے ایسے آدمی کی جو بیوی کو فراموش کرکے دوسری لڑکیوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ہے مگر ایک روز ہوٹل میں اس کا سامنا اپنی ہی بیوی سے ہوتا ہے جو کسی دوسرے مرد کے ساتھ اسی کام سے آئی ہوتی ہے۔ 'لائی پاپ' بالی ووڈ میں عام ہوچکے کاسٹنگ کاؤچ (Casting Couch) کی کہانی ہے جس میں نہ صرف سیاسی لیڈروں کے بالی ووڈ سے تعلقات سے پردہ ہٹایا گیا ہے بلکہ اس بات کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایسے لوگ کس طرح روزگار اور شہرت کا جھانسا دے کر لاچار لڑکیوں کا جنسی استحصال کرتے ہیں۔ اس کے برعکس 'غیرت' ایک باپ کی غیرت کی داستان ہے جو بیٹی کو اس کے یار کے ساتھ اختلاط کرتے پکڑلیتا ہے اور باز پرس کرنے کے بجائے خود ہی موت کو گلے لگاتا ہے۔ 'حاضر غائب' فریب خیال کی نفسیاتی کہانی ہے جس میں علامتی طرز اظہار استعمال کیا گیا ہے۔ دوسری جانب 'تشنۂ آرزو' میں عروس البلاد ممبئی میں روزگار کی کشاکشی اور تگ و دو پر روشنی ڈالی گئی ہے جب کہ 'شہر گمزی' کا موضوع سماجی بدعت ہے جس میں ایک لڑکی جہیز کی مانگ کرنے والے سسر کو پولیس کے حوالے کردیتی ہے۔ 'وہ دونوں کون تھے؟' الگ ہی طرز کا افسانہ ہے جس میں تجسس و تذبذب Suspense کا عنصر غالب ہے۔

علاوہ ازیں مندرجہ ذیل افسانے دراصل 'افسانچے' کے زمرے میں رکھے جاسکتے ہیں۔ افسانچے دیوز' تذویج محرمات پر لکھا گیا ہے جب کہ 'بوتیرتون' کا موضوع کثیرالجنسی ہے۔ 'فولادی ایمان' میں خود دار طوائف ہمدرد گاہک کا دیا ہوا کچھ روپیہ بھیک سمجھ کر لوٹا دیتی ہے۔ گاہک کے استفسار پر وہ یوں جواب دیتی ہے: ''دیکھو صاب، وہ ادھر جو اوپر بیٹھا ہے نا۔ وہی اکھا دنیا کا کھانا پانی چلاتا ہے۔ اپن بھی تیج دنیا میں رہتی ہے کرکے اپنا بھی چلتا ہے''۔ 'منصوبہ بندی' میں مرکزی کردار کو جب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس کا والد اس کو ہتھیار بنا کر اپنے قرض چکانے کا منصوبہ بنا رہا ہے تو وہ والد کو خبر کیے بنا کورٹ میں شادی کرلیتا ہے۔ اور 'داغ' میں ایک لڑکی اپنے حسن کے تمغے میں اپنی جوانی کھو بیٹھتی ہے۔ 'سودا' انسانی حرص و طمع کی کہانی ہے جبکہ 'شناخت' ایک غریب کا المیہ ہے جو مفلسی کے سبب اپنی کوئی پہچان نہیں بنا پاتا۔ 'نوراعظم' ہے ان لوگوں پر جو عمرہ کو بھی تفریح کا بہانہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح 'جواب' میں بھی موجودہ اقلیات پر طنز کیا گیا ہے کہ دہشت گردی اگر قبائلی کریں تو تسلسل واد کہلائے، ہندو کریں تو اگروا د کہلائے اور اگر مسلمان کریں تو آتنک واد کہلائے۔

افسانوں کو مطالعہ کرنے سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اشتیاق سعید کے یہاں مقصدیت ہے، موضوعی رنگا رنگی ہے اور وہ اپنے اردگرد کے ماحول ہی سے اپنے کردار چنتے ہیں۔ انھوں نے جنسیت کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے اور مبہم علامتوں اور استعاروں سے پرہیز کیا ہے۔ وہ روزمرہ کی زبان استعمال کرتے ہیں لیکن مکالموں میں حسب ضرورت دیہاتی بولی سے استفادہ کرتے ہیں تاکہ کرداروں کی شخصیت واضح طور پر ابھر آئے۔ انھوں نے سائبر ورلڈ سے منسوب لفظیات اور دیگر انگریزی الفاظ کا خوب استعمال کیا ہے جیسے اسکرین، کرلیش، ڈاؤن لوڈ، کرسر، ڈیلیٹ، انٹرنیٹ، فاکانس، مین امیج، نارمل، انارمل، ایکسپر یسڈ وغیرہ۔ البتہ کئی الفاظ کے متبادل اردو میں دستیاب ہیں اس لیے ایسے انگریزی الفاظ غیر ضروری لگتے ہیں۔ علاوہ ازیں افسانہ نگار کو گرامر اور املا کی طرف بھی توجہ دینی پڑے گی۔

مختصراً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زیر نظر افسانوی مجموعہ موجودہ معاشرے کو آئینہ دکھاتا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اردو حلقے میں اس کی پذیرائی ہوگی۔

☆☆☆

بقیہ: ظفر علی خاں اور اقبال...

صفحہ ۸ سے آگے

چار بجے کرتہ پاجامہ پہنے ننگے سر چپکے سے باہر نکلے اور لمبی سیر کو چل دیے۔ راستے میں پولیس کے ایک سپاہی نے جو گشت پر تھا دور سے بھانپا کہ یہ آدمی کوئی بڑی واردات کرکے آیا ہے اور تیزی سے کسی خفیہ ٹھکانے کی جانب جا رہا ہے۔ اس نے تعاقب کیا، مولانا اس کا منشا سمجھ گئے اور ازراہ دل لگی پہلے تیزی سے چلنا شروع کیا اور کچھ آگے جاکر دوڑنا شروع کردیا، سپاہی بھی ڈبل مارچ کرتا

ہوا چھپے چھپے ہو لیا۔ کئی فرلانگ کی لمبی دوڑ کے بعد مولانا کو جا لیا اور جب غور سے انھیں دیکھا تو چہرہ پہچان کر آداب عرض کیا۔ مولانا نے پوچھا "ہانپ کیوں رہے ہو؟" تو سپاہی نے دست بستہ عرض کی کہ حضور مہ اندھیرے اپنا مخصوص لباس ترکی ٹوپی اور کوٹ پہن کر سیر سپاٹا کیا کریں، خواہ مخواہ ہم پولیس والوں کو شک میں نہ ڈالا کریں، اتنا کہہ کر سپاہی نے معافی مانگی اور واپس ہولیا۔ مولانا نے جب دفتر میں یہ واقعہ اپنے رفقا کو سنایا تو سب ہی کھول کر ہنسے اور دن بھر اسی کا چرچا رہا۔

مولانا عربی، فارسی اور انگریزی کے بلند مترجم اور دلی، لکھنؤ اور حیدرآباد کے اردو اسکولوں کے اداشناس تھے۔ وہ بے مثال نعت گو، اعلا پایے کے طنزنگار اور بے بدل ہجو گو تھے۔ شرفا اور رؤسا کے گھروں میں بولی جانے والی اردو زبان کے ہر محاورے اور استعارے پر ان کی نظر تھی۔ حیدرآباد سے اجڑنے کے بعد وہ بمبئی پہنچے اور اپنے ہمسروں اور ہم عصروں کے ساتھ مل کر ایک تبلیغی اور علمی ادارہ قائم کیا، وہ ابوالکلام آزاد، ابوالاثر آو، ظہیر حسن ثنا اور آغا حشر کاشمیری کے ساتھ عیسائیوں اور آریہ سماجیوں سے مناظرے کیا کرتے تھے۔ مناظروں میں یہ سب حضرات اپنی خداداد صلاحیتیں صرف کرتے تھے۔ پنجاب کی ادبی محفلوں میں مولانا اپنی شاعرانہ تجلیوں کی پھلجڑیاں بکھیرا کرتے تھے۔ منشی تلوک چند محروم کے اعزاز میں لاہور کے اہل فن نے ایک تقریب آراستہ کی۔ مولانا ظفر علی خاں اس موقعے پر موجود تھے، فرمایا کہ:

دو کون ہے نہ خدا جس کو ہو طلب لعل
تلوک چند ہی بے چارہ رہ گیا محروم

حضرت خواجہ حسن نظامی سے مولانا کی اکھاڑ پچھاڑ رہتی تھی۔ مولانا اپنی روایتی عربی اور فارسی آمیز زبان میں اپنے نوادرات حضرت خواجہ کی خدمت میں پیش کرتے اور خواجہ اپنے ترجمان 'منادی' میں روزنامچہ لکھتے ہوئے ہلکی پھلکی مگر شگفتہ اردو میں اس کا دل چسپ جواب دیتے۔ ان دونوں صاحب طرز ادیبوں کی چھیڑ چھاڑ اردو صحافت کی تاریخ کا ایک انمول حصہ ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے ایک بار فرمایا:

صوفی بھی ہیں، ہرجس بھی ہیں اور ملنگ بھی

اور خواجہ جانتے ہیں تجارت کا ادھنگ بھی

نوجوان احرار رہنما آغا شورش کاشمیری ایک بار قید کاٹنے کے بعد رہا ہوئے تو سیدھے دفتر 'زمیندار' میں مولانا ظفر علی خاں سے ملنے پہنچے۔ مولانا نے شورش کو خوش آمدید کہا اور تھپکی دیتے ہوئے یہ شعر ارشاد کیے:

کیا عجب ہے شورش کے لیے ہو زنداں میں بند تو اے
تو نے حق کہہ کر کہ ہے حق میں حق رہا ہے گرفتہ تو کو
نسیں کا سر ہے آسماں پر جو کل تو بھی شان پر
تو کرے گا سر بلند تو ہو جو سر کر جے بلند تجھ کو

مولانا کی اپنی زندگی کے کم و بیش چودہ برس انگریز سرکار کے زندانوں میں کٹے۔ بارہا اُن کے اخبار 'زمیندار' کی ضمانتیں ضبط ہوئیں، قرقیوں اور جرمانوں کی شکل میں انھیں ہزاروں روپے سرکاری خزانوں میں جمع کرانے پڑے۔ بے شمار تعلیم یافتہ نوجوان تھے جو روزنامہ 'زمیندار' سے منسلک رہ کر ممتاز صحافیوں کی صف میں شامل ہوئے۔ مولانا نے برسوں وطن پرور جماعتوں کی مختلف تحریکوں کی قیادت کی۔ وہ چوٹی کے رہنماؤں مولانا آزاد، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، ڈاکٹر ستیہ پال، لالہ لاجپت رائے، ڈاکٹر گوپی چند بھارگو، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کے رفیق و ہم سفر رہے اور ان کے ہمراہ قید و بند کے مشکل ترین لمحات سے گزرتے رہے۔ ۱۹۳۷ء میں انھوں نے چند ناگزیر حالات کے تحت انڈین نیشنل کانگریس سے اپنا ناطہ مکمل طور پر توڑ لیا۔ وہ دو قومی نظریے پر ایمان لے آئے اور ۱۹۴۰ء میں قرارداد لاہور پاس ہونے کے بعد مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ انھوں نے ملک کے بٹوارے کی حمایت کی اور اخبار 'زمیندار' فرقہ پرست عناصر کا بھونپو بن گیا۔ تقسیم کے بعد مولانا نے اپنی آزاد روی نہ چھوڑی اور حکومت پاکستان کے زیر عتاب رہے۔ نئے ملکی حکمرانوں نے اُن کے ساتھ ناروا سلوک اختیار کیا۔ 'زمیندار' کی حالت دگرگوں ہوگئی اور یہ کئی ہچکولے کھا کر بند ہوگیا۔ خود مولانا کا انجام بڑا دردناک ہوا۔ اخبار 'زمیندار' اور مولانا ظفر علی خاں کی المناک داستان دل دہلا دینے والی ہے اور ایک الگ مضمون کی محتاج ہے۔ زندگی نے فرصت دی تو خون اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی یہ رقت انگیز حکایت بھی بیان کروں گا جسے پڑھ کر آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔

○○

بقیہ: اردو ادب اور قومی یکجہتی

صفحہ ۲ سے آگے

ادب ہر اس تحریک کے شانہ بہ شانہ رہا ہے جس سے حب الوطنی کو تقویت ملتی ہو اور عوامی بیداری کے ذریعے آزادی وطن کی نئی صبح کی آمد یقینی بنتی ہو۔ وہ چاہے تحریک خلافت ہو یا سول نافرمانی، تقسیم بنگال ہو یا ۴۲ء کی بغاوت، آزاد ہند فوج ہو یا گرم دل کی سرگرمیاں، ہندستان کی جنگ آزادی کی مکمل تاریخ اردو ادب میں محفوظ ہے۔

آزاد ہندستان کی تاریخ میں بھی وہ ایسے مواقع موجود ہیں جب ہندستانی ادیبوں اور شاعروں کے لیے وقت آزمائش درپیش رہا۔ یہ تھے ہند چین جنگ اور ہند پاک جنگ۔ ہند چین جنگ کے دوران اردو شعرا نے عوام میں جوش بھرنے کا اور ان کو ملک کی سالمیت اور اس کے تحفظ کے لیے برسرپیکار کرنے کا فریضہ اس حسن و اخلاص کے ساتھ سرانجام دیا کہ پورے ملک میں اردو کے نغمے گونج اٹھے تھے۔ جاں نثار اختر کی نظم 'آواز دو ہم ایک ہیں'، کیفی اعظمی کی 'بت شکنی'، حرمت الاکرام کی 'ہمالہ کی جانب چلو' اردو کی ایسی نظمیں ہیں جن کی آواز سے پورا ہندستان گونج اٹھا تھا۔ ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ کے دوران بھی اردو ادب نے اسی طرح اپنا فرض نبھایا تھا اور پوری قوم کو بلا لحاظ مذہب و ملت ایک پرچم تلے اکٹھا کرنے میں مدد کی تھی۔ اس دور کی نظموں میں کیفی اعظمی کی 'فرض'، علی سردار جعفری کی 'صبح فردا' اور ساحر لدھیانوی کی 'اے شریف انسانو' ایسی نظمیں ہیں جن پر اردو ادب بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

آزادی وطن سے پہلے بھی اور آزادی وطن کے بعد بھی اردو ادب کو ایک بہت بڑے قومی مسئلے سے نبرد آزما ہونا پڑا ہے۔ یہ مسئلہ ہے باہمی نفرت کا مسئلہ جو ان حیوانی عناصر کا پیدا کردہ ہے جن کو مذہب کے نام پر ہوا دے کر موقع پرست لوگ اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں مگر جن سے قوم کی روح زخمی ہو جاتی ہے۔ یہ حیوانی عناصر فرقہ واریت میں جا بجا ظاہر ہوتے ہیں اور صدیوں سے ایک ساتھ مل جل کر رہ رہے لوگوں کو وحشیانہ جذبات سے ہم کنار کر دیتے ہیں۔ اردو شاعری نے، اردو ناول اور افسانے نے ہر اس موقعے پر جب ہندستان کی مقدس سرزمین پر ایسے عناصر نے سر اٹھایا ہے، اپنے قارئین کو امن و آشتی کا پیغام دیا ہے۔ معاشرے کی صحت مند قدروں کی بحالی کے لیے اور وطن دشمن طاقتوں کی پسپائی کے لیے جس محبت اور خلوص کی اشد ضرورت ہندستانی معاشرے کو ہے، اس شعور کو پیدا کرنے میں اردو ادب نے بھی کرشن چندر کے افسانے 'ہم وحشی ہیں' کی زبان سے نفرتوں کو دھونے کی کوشش کی ہے، کبھی رام لعل کے 'میں یہاں نہیں رہتا' کی زبان سے، کبھی کوثر چاند پوری کے 'عشق آتش نمرود' کی زبان سے اور کبھی اکرام جاوید کے 'اک عہد وفا اور' کی زبان سے۔ کبھی اس نے 'بکھرے پھول' (ظہیر انصر) اور 'ابرام' (ابراہیم یوسف) جیسے ڈراموں کے ذریعے اپنے قارئین کو فرقہ واریت کے شیطانی پنجوں سے محفوظ رہنے کی تلقین کی ہے اور کبھی جاں نثار اختر کی 'قومی وحدت'، وامق جونپوری کی 'ہم جیسیں'، رفعت سروش کی 'عروس یکجہتی'، سردار جعفری کی 'نفرتوں کی ہر رنجش'، کیفی اعظمی کی 'بہروپنی' جیسی نظموں کے ذریعے ان کے دلوں کو تہذیب نفس انسانی کی قدروں سے بھر دیا ہے۔

انسانی بھائی چارہ، رواداری، دوسرے کے جذبات کا احترام، امن پسندی اور صبر و استقلال جیسے اوصاف کو اپنے اندر سمو کر اردو ادب نے تمام ہندستانیوں کو ان کے مذہبی، نسلی اور اخلاقی وجود سے اوپر اٹھا کر یکتائی کا ری سے ایک مالا میں پرونے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ ایسا نہ کر کے اردو اپنے وجودی مقصد ہی سے انحراف کر رہی ہوتی۔

●○●

بقیہ: موازنۂ کلام غالب...

صفحہ ۳ سے آگے

اہم کام میں تقریباً دس سال کا وقت صرف ہوا، اس لیے کہ اکابر ہنگام کے حالات مختلف کتب میں چھپے ہوئے ہیں، جن کا حصول وقت طلب کام تھا، لیکن یہ سب مشکلیں اللہ نے حل کرادیں یہاں تک کہ ان بزرگوں کی اولادوں تک کی نشان دہی اور تفصیل درج کردی ہیں۔

سال ۱۹۵۸ء میں ایک سلسلہ قائم کیا کہ اردو کے ادیبوں اور شاعروں کے حالات اُن کے اپنے دست و قلم سے تحریر کراؤں گا، اس ذیل میں اب تک تقریباً ڈیڑھ دو سو کے قریب ادبا کی تحریریں راقم کی تحویل میں ہیں۔ مثلاً پروفیسر عابد حسین، امتیاز علی عرشی، آل احمد سرور، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر سید احتشام حسین، محترم مشفق خواجہ، سردار جعفری، ذاکر صاحب، یوسف حسین خاں، شاہد احمد دہلوی، ابراہیم جلیس، کرشن چندر اور گلزار دہلوی کے سوا پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی، محترم شمس الرحمن فاروقی، صالحہ عابد حسین، شاہد علی خاں، ابوالکلام قاسمی وغیرہ کے حالات ان کے دست و قلم کے تحریر کردہ راقم کے پاس محفوظ ہیں جو ایک ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کوائف میں اُن کی ولدیت، تاریخ پیدائش، تعلیم اور نظریہ ادب کے سوا بہت اہم شعرا کے کس شعر کو پسند کرتے ہیں۔ شوکت تھانوی نے میر تقی میر کا یہ شعر اپنی پسند کے مطابق بہتر شعر کے ضمن میں تحریر کیا ہے:

ہوگئی صبح شفق باقی ہے
اب بھی آجا کہ رمق باقی ہے

اگر موقع ملا تو اس دستاویز کو اسی شکل میں شائع کراؤں گا یا ملک کی کوئی اردو اکادمی اگر اس کی طباعت کی ذمہ داری لے سکے تو میری خدمات حاضر ہیں۔

موازنہ کلام غالب اور صفیر بلگرامی کی اشاعت سے مقصود یہ ہے کہ غالب کی غزل پر ان کے عہد میں ان کے شاگرد خاص نے بھی طبع آزمائی کی تھی، جو پردۂ خفا میں تھی، اب اسے اہل ادب و دانش افراد بھی ملاحظہ کر کے شاد کام ہوں۔

●○●

ماضی کی یادیں

ظفر علی خاں اور اقبالؔ کی گائے کا قصیدہ

وشوانا تھ طاؤس (C-38، سیکٹر 39، نوئیڈا یوپی 201303)

مولانا ظفر علی خاں ایک غیر معمولی قلب و ذہن کے صحیفہ نگار تھے۔ اُن کی ہمت ہمیشہ بلند اور اُن کے عزائم سدا جوان رہے۔ اُن کا قلم اپنی روانی میں کرۂ ارض کے جری اور دلیر مجاہدین کی شمشیر آبدار سے کم نہیں تھا۔ وہ اپنے حریف پر تیکھا وار کرکے بڑی جرأت اور بے باکی سے آگے نکل جاتے تھے۔ اُن کی نثر انقلاب و زلزلہ پیدا کرتی تھی تو اُن کی نظم بھی نعرۂ مستانہ تھی۔ عوام کے جذبات کو اُبھارنے اور پھر تحریکوں کی قیادت اُٹھانے میں کمال حاصل تھا۔ وہ زندگی بھر راہ و منزل سے بے نیاز ہوکر میدانِ کارزار میں بڑھتے رہے اور محمل تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرزمین ہند میں فرزندانِ توحید کی نشاۃ ثانیہ کے محرک پانچ افراد تھے۔ حسین احمد مدنی، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، عطاء اللہ شاہ بخاری اور ظفر علی خاں، اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

علامہ اقبالؔ اور مولانا ظفر علی خاں کے آپس میں سیاسی اور نظریاتی اختلافات تھے۔ علامہ انگریز کے خطاب یافتہ 'سر' تھے جب کہ مولانا فرنگیوں کے ازلی و ابدی دشمن، اقبالؔ نے سائمن کمیشن کی حمایت کی تھی تو ظفر علی نے مخالفت، اس ضمن میں انھوں نے اپنے اخبار 'زمیندار' کے صفحۂ اول پر علامہ کے خلاف ایک طویل نظم لکھی اور طعن کسا "قوم کی لٹیا ڈبوئی کس نے؟ سر اقبال نے؟"۔ اقبالؔ نے نہرو رپورٹ کی تنقیص کی تو ظفر علی خاں نے اس رپورٹ کی توصیف کی۔ اس چپقلش کے باوجود ان کے ذاتی روابط رفیقانہ اور برادرانہ رہے۔ اُن کے خوشگوار مراسم کا بیان ان خطوط سے ملتا ہے جو مولانا ظفر علی خاں نے علامہ اقبالؔ کو لکھے۔ حیدرآباد میں نظام دکن کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد جب ظفر علی خاں اپنے وطن کرم آباد (پنجاب) واپس پہنچے اور اپنے والد گرامی منشی سراج الدین کے ہفتہ وار اخبار 'زمیندار' کی ادارت سنبھالی تو اُن کو اخبار کرم آباد سے لاہور لانے کا مشورہ جن دوستوں نے دیا اُن میں علامہ اقبالؔ بھی شامل تھے۔ انھیں 'زمیندار' میں شائع شدہ مولانا کے مضامین بہت پسند آتے تھے جن میں ملت بیضا کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی تھیں۔ جب اخبار لاہور سے شائع ہونا شروع ہوا تو مولانا کا اکثر علامہ اقبالؔ کی رہائش گاہ پر آنا جانا رہتا تھا۔

علامہ اقبالؔ نے ایک گائے پال رکھی تھی، جس سے وہ بہت پیار کرتے تھے۔ ۱۹۲۵ء کا واقعہ ہے جب اس گائے نے ایک بچھڑے کو جنم دیا۔ علامہ بہت خوش تھے، وہ گائے اور بچھڑے کو دیکھنے کے لیے کئی بار گئے۔ اس موقعے پر انھوں نے اپنے پرانے ملازم علی بخش کو گائے کی کھیس مولانا ظفر علی کے گھر پہنچانے کی تاکید کی۔ علی بخش یہ کھیس چاندی کے ایک نفیس برتن میں رکھ کر اور اس پر چاندی کے ورق اور بادام و پستے سے سجاوٹ کرکے مولانا کے ہاں پہنچا۔ مولانا نے اس تحفے کو دل و جان سے قبول کیا۔ اس زمانے میں لوگوں کا دستور یہ تھا کہ جب کوئی شخص کھیس لے کر آئے تو اُسے خالی ہاتھ نہیں بھیجا جاتا تھا بلکہ اُسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور دیا جاتا تھا۔ شادمانی کے اس موقعے پر مولانا ظفر علی خاں نے علامہ اقبالؔ کو یہ فی البدیہہ نظم لکھ کر علی بخش کے ہاتھ بھجوادی:

جو اپنی بھینس 'زمیندار' کو بھا نہ سکے
وہ بھوں نہ جائے ڈاکٹر اقبالؔ کی وہ گائے
فریاد نالہ نہ جسے کوہسار سے
دودھ جو شیر وادی پنجاب میں بہائے
ہو ناظرین کے لیے سرمۂ سرور
مستورہ و بہار کی جھلک جو دکھائے
ڈکرائے مال روڈ پہ جاکر علی الصباح
اور نعرہ اتحاد کا لاہور کو سنائے
تحسین جو کرائے تو امرت رس پڑے
موتی بکھیریں اگر وہ کہیں کان پھڑپھڑائے

ہنگامہ پرور صحافت مولانا ظفر علی خاں کا طرۂ امتیاز تھی۔ یہ ان کی فطرت میں تھا کہ کسی نہ کسی سے لڑائی مول لی جائے اور ہنگامہ آرائی کے دوران اپنے قلم سحر طراز کے جوہر دکھائے جائیں۔ ایک زمانے میں انھوں نے صوفیوں اور سجادہ نشینوں کے خلاف جنگ و پیکار کی طرح ڈال دی، پیر جماعت علی شاہ اور ان کے رفقا کے خلاف شور وغوغا برپا کردیا، ابن سعود کی حمایت اور بدعتوں کی مخالفت میں زمین و آسمان ایک کردیے۔ کبھی کانگریسی علما کے موقف کی حامی بھری جارہی ہے تو کبھی ڈاکٹر اقبالؔ کی مسلمانوں کی تحریک حقوق کی مخالفت کی جارہی ہے اور اقبالؔ پر تابڑ توڑ حملے ہو رہے ہیں۔ کبھی شدھی اور سنگھٹن کے خلاف "دے رگڑے پہ رگڑا دھر رگڑا" قسم کی جوشیلی نظمیں قلم بند کی جارہی ہیں اور اخبارات سے پنگا لیا جا رہا ہے۔ لاہور کی مساجد کے اماموں کی جانب سے مولانا پر یکے بعد دیگرے کفر کے فتوے لگائے جارہے ہیں اور اُن کا اخبار 'زمیندار' پڑھنے والوں کی تکفیر کی جارہی ہے۔ مولانا جواباً غیظ وغضب کے عالم میں نظم و نثر کے شہ پارے صادر کررہے ہیں۔ کبھی انگریز حکمرانوں سے ٹکر لے رہے ہیں، روزنامہ 'زمیندار' کی ضمانتیں ضبط ہورہی ہیں، پریس سربمہر کیا جارہا ہے اور مولانا کو جیل بھیجا جارہا ہے۔ مولانا سزا بھگت کر رہا ہوتے ہیں اور چند روز بعد پھر سرکار سے پنگا لے کر جیل جارہے ہیں۔ باہر آتے ہیں تو قادیانیوں کے خلاف شور وغوغا برپا کرتے ہیں۔ حکومت پنجاب باربار اس منافرت کی شدت پر اعتراض کرتی ہے مگر مولانا باز نہیں آرہے ہیں۔ احراریوں سے خوش ہوتے ہیں تو ان کی تعریف میں قصیدے چھاپتے ہیں، ناخوش ہوتے ہیں تو ہجو بناتے ہیں۔ کبھی خاکساروں کے جوش جہاد کی داد دیتے ہیں تو کبھی اُن کے عقائد کو خلاف شرع قرار دیتے ہیں۔ پھر اچانک ایک دن ایسا آتا ہے کہ یہ سب طوفان تھم جاتا ہے اور مولانا عید کے دن اپنے سبھی مخالفین سے گلے ملتے ہیں۔

مولانا مسلمانوں کے حق میں نت نئی اسکیمیں بنانے میں یکتا تھے۔ ایک دن اخبار کے دفتر میں مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک سے کہنے لگے "میں نے منصوبہ تیار کیا ہے کہ برادران اسلام سے ایک بڑی رقم فراہم کی جائے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی آٹھ کروڑ ہے، اگر وہ دو آنے فی کس بھی دیں تو ایک کروڑ روپیہ چندہ فراہم ہوجاتا ہے، اس میں سے کچھ رقم 'زمیندار' کے نئے شاندار دفتر کی تعمیر اور ایک بہت بڑے مطبع پر صرف کی جائے آپ دونوں کے لیے دو کوٹھیاں اس احاطے میں بنوائی جائیں، ایک ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ دے کر علامہ اقبالؔ کو تبلیغ اسلام کے لیے ملک چین روانہ کردیا جائے۔"

مولانا مہر اور مولانا سالک خاموشی کے ساتھ یہ سب سنتے رہے اور آخر میں عرض کیا کہ یہ ایک کروڑ روپیہ یکجا کرنے کے لیے تحصیلوں کی جو تنظیم قائم کی جائے گی اس پر بھی تو خاصی رقم خرچ ہوگی وہ کہاں سے آئے گی؟ مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا: "جی ہاں، مشکل تو یہی ہے کہ یہ ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا"۔ اتنا کہہ کر انھوں نے اپنے وفادار ازلی ملازم کو آواز دی "ارے یاسین ذرا حقہ تو بھر دو"۔ حقہ تیار ہوا، مولانا نے کش لیا اور اس اسکیم کو اپنی پہلے کی کئی اسکیموں کی طرح ہوا میں اڑا دیا۔

مولانا نے ایک پرہیزگار کی طرح زندگی بسر کی، روزمرہ میں صحت کے بارے میں مکمل احتیاط برتتے رہے، سیر و ورزش میں کبھی کوتاہی نہیں کی، وہ صبح جلدی بیدار ہوتے اور جی بھر کے سیر کرتے۔ 'پیسہ اخبار' کے مدیر محبوب عالم، دارالاشاعت کے مولوی سید ممتاز علی، سرگنگا رام، رائے بہادر کنج بہاری تھاپر، ڈاکٹر نہال چند سیکری اور لاہور کے کئی ممتاز شہری سیر میں مولانا کے ساتھی ہوتے جن سے عالمی اور ملکی معاملات پر بحث و مباحثہ اور مشورہ کرتے اور فی البدیہہ شعر عطا فرماتے۔ ایک روز آدھی رات کے کچھ دیر بعد شدید اجابت ہوئی، بہت کوشش کی مگر بے چینی دور نہ ہوئی تو بستر سے اٹھ بیٹھے اور صبح

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ) دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک آٹھ امریکی ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
Email: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org